اردو میں تاریخ نگاری

(۱۹۴۷ء کے بعد کے رجحانات کا تجزیہ)

(۲)

ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی، علمی اور ادبی تاریخ نویسی کا دوسرا اہم مرکز علی گڑھ ہے۔ یہاں تاریخ پر اردو میں تحقیق و تصنیف کے آغاز کا سہرا خلیق احمد نظامی صاحب کے سر ہے۔ نظامی صاحب نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر انگلش اور اردو میں متعدد اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع کی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں ان جدید تنقیدی طریقوں کو استعمال کیا ہے جو یورپ میں رائج ہیں اور جن سے ماخذوں میں پائے جانے والے تاریخی مواد کی سائنٹفک طریقہ پر توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا ان کی کتابوں میں ہر دور کے تاریخی عوامل کی کارفرمائی اور معاشرے میں ثقافتی اور معاشی تبدیلیوں کا جو کہ مختلف ادوار میں واقع ہوئیں بڑی کامیابی کے ساتھ تنقیدی تجزیہ ملتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کے کچھ ایسے پہلوؤں پر بھی قلم اٹھایا ہے جن کی طرف پہلے توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ان کی ہر کتاب سے نئے نئے ماخذوں کی نشاندھی بھی ہوتی ہے۔

نظامی صاحب کی دو مشہور کتابیں "تاریخ مشائخ چشت" اور "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" ۱۹۵۳ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئیں۔ تاریخ مشائخ چشت کے پہلے ایڈیشن میں ایک طویل مقدمہ میں تصوف کی ابتدا اور نشو و نما کے علاوہ اُن سلسلوں کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر تھا جو کہ ہندوستان میں متعارف ہوئے۔ مقدمہ ہی میں چشتی سلسلے کے ہندوستان میں بانی شیخ معین الدین چشتی سے لے کر ساتھویں صدی تک کے نامور چشتی بزرگوں کا ذکر ہے اس کے بعد کتاب کا خاص حصہ اٹھارویں صدی کے اہم صوفی شیخ کلیم اللہ سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے صوفیاء پر ختم ہوتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں پہلے ایڈیشن کا مقدمہ نظر ثانی اور مزید اضافہ کے بعد ایک علیحدہ جلد میں ادارۂ ادبیات دہلی سے شائع ہوا۔ یہ تاریخ مشائخ چشت کی پہلی

تعارفی جلد ہے[۱] اس میں بعض نئے ابواب کے شمول کے علاوہ اس کی تکمیل میں نئے اور سائنٹفک اسالیب تحقیق کا استعمال کیا گیا ہے۔ لہٰذا تحقیق کا پہلے سے معیار بہت بلند ہے۔ پہلی جلد کے بعد تاریخ مشائخ چشت کی پانچویں جلد ۱۹۸۳ء میں ادارہ ادبیات دہلی ہی سے شائع ہوئی۔ اس میں بھی ہر باب میں نئے مواد کا اضافہ ہے۔ کتاب کا پہلا باب شاہ کلیم اللہ سے شروع ہوتا ہے اور بیسویں صدی کے بزرگوں پر ختم ہوتا ہے۔ ہر باب میں صوفیاء کے حالات اور اُن کی تعلیمات کے علاوہ اُن کے علمی اور ثقافتی کارناموں پر بھی سیر حاصل بحث ہے[۲] دونوں جلدیں تاریخ، ثقافت اور ادب کے طلباء کے لیے بے حد مفید ہیں۔

اسی طرح سے "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" میں ایک راسخ العقیدہ سنّی عالم کی علمی اور دینی خدمات کے علاوہ ہندوستان میں تیرہویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک اسلامی علوم اور عربی ادب کی ترقی کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اکبر کے دینی افکار اور حکمت عملی سے مسلم معاشرہ میں، خصوصاً علماء میں جو بے چینی پیدا ہوئی اور انھوں نے اکبر کے خلاف اسلام کے دفاع میں جو خدمات انجام دیں اور قربانیاں دیں اُن سب کی بہت دلچسپ تصویر ملتی ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ نظامی صاحب کی تصنیف "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" تحقیق کے نقطۂ نظر سے بہت اہم کتاب ہے[۳] اس کتاب کا آغاز ایک طویل مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں تاریخ اسلام میں سلطنت دہلی کی اہمیت، سلاطین دہلی اور بغداد کے عباسی خلفاء کے مابین تعلقات کی نوعیت، اور سلطنت میں ہندوؤں کی حیثیت کو تاریخی واقعات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ چودہ (۱۴) ابواب میں سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر لودی سلاطین تک سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، اُن کے سیاسی نظریات، امراء، علماء اور مشائخ وقت سے تعلقات رفاہ عام کے کام، سلاطین اور غیر مسلم لوگوں کے مابین تعلقات سلاطین اور امراء کی ثقافتی اور تعلیمی اداروں سے دلچسپی اور ان کی مالی مدد، غربا، کی مدد کے لیے اوقاف کا قیام اور

---

[۱] یہ پہلی جلد ۵۰۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

[۲] خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ندوۃ المصنفین، دہلی ستمبر ۱۹۵۳ء

[۳] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۸ء

مختلف صنعتوں اور فنون لطیفہ کی ترقی کے لیے سلاطین اور امرا کی مساعی کا عالمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کتاب میں شعرا کے قصائد، ادبا اور فضلا کے علمی کارنامے، سکہ جات اور تاریخی عمارتوں کے کتبات کو اردو میں تاریخ کے ماخذوں کی حیثیت سے پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ مواد کی توجیہہ میں معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے سلاطین اور ان کے عصر کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ہم تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں صدیوں کی فضا کا ادراک کرنے لگتے ہیں۔ سلطان معزالدین کیقباد اور سلطان جلال الدین خلجی کی مجالس طرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں[۱]۔ تاہم کہیں کہیں کچھ چیزیں وضاحت طلب رہ گئی ہیں۔ مثلاً سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی (۱۳۱۷ تا ۱۳۲۰) کے شیخ نظام الدین اولیا سے تعلقات کے بیان میں نظامی صاحب نے برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور خیر المجالس سے عینی شہادت کا حوالہ دیتے ہوئے سیر العارفین کی حکایت نقل کی ہے۔ اس سلسلے میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا بیان نقل کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی دشمن نے سلطان کو بھڑکایا کہ شیخ امداد اور ملوک کی فتوح[۲] قبول کر لیتے ہیں لیکن حضور کے بھیجے ہوئے تحائف قبول نہیں کرتے۔ سلطان کو ذلت کا احساس ہوا اور حکم دیا کہ کوئی امیر شیخ کے یہاں نہ جائے" اور اس کے بعد مزید کہا: "پھر دیکھوں گا کہ مطبخ اور لنگر کہاں سے چلائیں گے"۔ جب شیخ کو معلوم ہوا تو انھوں نے حکم دیا کہ مطبخ کا خرچ بڑھا دیا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد سلطان نے شیخ کی خانقاہ کا حال معلوم کیا تو لوگوں نے بتایا کہ روزانہ کا خرچ دوگنا ہو گیا ہے۔ سلطان شرمندہ ہو کر کہنے لگا کہ وہ غلطی پر تھا"[۳]

خیر المجالس کے بیان کے بعد مصنف شیخ جمالی کی تالیف 'سیر العارفین' کی حکایت کو بغیر کسی تنقید کے نقل کرتے ہیں کہ اُن دنوں شیخ کی خانقاہ میں دو ہزار تنکہ یومیہ لنگر پر خرچ ہوتا تھا مسافروں اور متعلقین پر خرچہ اس کے علاوہ تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ جو امیر شیخ کی خدمت میں نذرانہ پیش کرے اُس کی جاگیر ضبط کر لی جائے "وازیں معنی احتیاط و مبالغہ نمود" جب شیخ کو اس حکم کی اطلاع ہوئی تو اپنے خادم خواجہ اقبال کو بلا کر حکم دیا کہ مطبخ کا خرچ دوگنا کر دیا جائے اور جس قدر

---

[۱] ایضاً ص ۱۹۳، ۲۱۳-۲۱۴۔ [۲] فتوح وتحفہ یا تحائف تھے جو کہ زائرین شیخ کی خدمت میں عقیدتاً پیش کرتے تھے۔ یہ نقد یا اشیا کی شکل میں ہوتی تھی۔

[۳] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۲۹۱، نیز خیر المجالس، ص ۲۵۸

روپیہ کی ضرورت ہو وہ ایک طاق سے نکال لیا کرے"۔ جب سلطان کو اس چیز کا پتہ چلا تو بہت متحیر ہوا۔[۱]

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ جمالی کے زمانہ تک آتے آتے تیرہویں اور چودھویں صدی کے بزرگوں کے بارے میں ایسی روایات مشہور کر دی گئی تھیں جن میں ان کی کرامات دکھانا مقصود تھا تاکہ مزاروں کی کشش بڑھ سکے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی ملفوظات فوائد الفواد اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی ملفوظات خیر المجالس کے مطالعہ کی بنا پر بعد کی حکایات میں افسانویت کا بآسانی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جمالی نے شیخ کی کرامت پر زور دینے کے لیے مطبخ اور لنگر کا یومیہ خرچ دو ہزار روپیہ ہونا اور سلطان کے حکم کے بعد اس کو دوگنا کرنا اور وقت ضرورت طاق سے روپیہ نکالنے کا اضافہ کیا ہے۔ درحقیقت شیخ نظام الدین اولیا یا کسی دوسرے عظیم صوفی کی خانقاہ میں فتوح کی شکل میں روپیہ امراء اور ملوک کے ذریعہ ہی نہیں آتا تھا، ہندوستانی اور بیرونی تجار صوفیاء کے بہت معتقد تھے۔ وہ مختلف ممالک کا تجارت کے سلسلے میں دشوار گزار راستوں سے سفر کرتے تھے۔ اکثر منت مانگتے تھے کہ اگر وہ سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے تو علاقہ کے شیخ کو فتوح پیش کریں گے۔[۲] برنی کے مطابق شیخ نظام الدین اولیا، کی خانقاہ میں روزانہ دہلی اور دہلی کے باہر کے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق فتوح پیش کرتا تھا۔[۳] شیخ کا معمول تھا کہ وہ رات ہونے سے پہلے فتوح کو مستحقین میں تقسیم کرا دیا کرتے تھے۔ اگلے دن کے لیے کچھ نہ بچتا تھا۔ لہٰذا سلطان کی طرف سے اُن کے یہاں امراء اور سرکاری عہدہ داران کی آمد پر پابندی لگ جانے کے بعد بھی مطبخ بآسانی چل سکتا تھا۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ نظامی صاحب نے تاریخ کے اہم موضوعات پر تحقیقی مقالات بھی شائع کیے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی ثقافت، مسلم معاشرہ میں دانشورانہ رجحانات، مذہبی فلسفہ و تفکر، قرون وسطیٰ میں فارسی ادب کی ترقی اور ترویج پر دلچسپ مواد ملتا ہے۔ بہت

---

[۱] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص۔ ۲۹۲ [۲] ملاحظہ کیجئے ابن بطوطہ انگریزی ترجمہ

The Travels of Ibn Batuta Eng. H. H. A. R. Gibb Vol. II, (Cambridge 1962) PP. 320-21

[۳] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ص ۳۴۳-۳۴۴

سے مقالات کا مجموعہ ۱۹۶۶ء میں ندوۃ المصنفین سے شائع ہوا[1] شیخ محی الدین ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود کا ہندوستان میں اسلامی فکر پر اثر کے موضوع پر مقالہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس موضوع پر انگریزی اور اردو میں اب تک کوئی دوسرا تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح مولانا ضیاء الدین بخشی کے حالات زندگی اور اُن کے عربی کارناموں پر مقالہ اولین اہمیت کا حامل ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں بھی قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم ثقافت، علم و دانش کی ترقی اور اسلامی تحریکات اور معاشرے پر ان کے اثرات کا مطالعہ شروع ہوا۔ اس سلسلے میں پہل شیخ محمد اکرام نے کی جو کہ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص تھے اور آزادی سے قبل انڈین سول سروس سے متعلق تھے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے تحقیقی موضوعات کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اُن جدید تنقیدی اور تحقیقی اسالیب سے بھی بہرہ ور تھے جن کے استعمال سے تاریخی واقعات اور ادبی اہمیت کے افسانوں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُن کی کتابوں کے مطالعہ سے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی تاریخ کے ماخذوں کا استعمال اکثر اس دیدہ ریزی اور احتیاط سے نہیں کیا جس کی ضرورت تھی۔ بلکہ لکھتے وقت مسلمانوں کے کم زور مذہبی معتقدات اور ان کی خوش عقیدگی ہر ردِ عمل ذہن و قلم پر غالب رہا ہے۔ تاہم اُن کی تین کتابیں "آب کوثر"، "رودِ کوثر" اور "موجِ کوثر"، اردو تاریخ نویسی کی تاریخ میں عہد آفریں ثابت ہوئی ہے۔ ہر کتاب کے نو دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور شیخ اکرام کی حیات میں ہر نیا ایڈیشن اضافہ کے ساتھ شائع ہوا۔

پہلی جلد آبِ کوثر میں عہد مغلیہ سے قبل کے دور کے مسلمانوں کی دینی، ثقافتی اور علمی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ ابتداءً جنوبی ہند میں عرب تجار کے ذریعہ اشاعت اسلام سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سندھ محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ کی فتح (۷۱۲ء) اور سندھ پر ان کے اثرات کا تجزیہ ہے۔ اس حصہ میں عربوں کی مذہبی رواداری اور ہندو سماج میں اسلامی اخوت اور مسلم نظام سیاست کی برکات کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، حالانکہ چچ نامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ محمد بن قاسم کے زمانہ تک آتے آتے عربوں کا وہ دینی جذبہ کم ہو گیا تھا جو کہ

---

[1] تاریخی مقالات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۶ء

خلفاء راشدین اور امیر معاویہ کے دور میں پایا جاتا تھا۔ اب سیاسی مصالح دینی مفاد پر فوقیت رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر چچ نامہ کے مطابق محمد بن قاسم نے سندھ پر تسلط قائم کرنے کے بعد وہاں ہندو معاشرے میں سماجی امتیازات کو برقرار رکھا۔ برہمنوں پر نہ تو جزیہ لگایا اور نہ اُن کو اُن کے قدیم عہدوں سے برطرف ہی کیا۔ اس نے برہمنوں کو نیک اور وفادار کے القاب سے نوازا۔ مزید برآں برہمنوں کو پرانے مندروں کی مرمت کے لیے اجازت دے دی۔ برعکس اس کے جاٹوں پر وہی پابندیاں عائد کیں جو کہ داہر کے زمانہ میں تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں جاٹ دیہاتوں میں کاشتکاری کرتے تھے۔ برہمن اور ہندو حکمراں طبقہ ان کو ذلیل اور ناپاک سمجھتا تھا۔

محمد بن قاسم کو اُس کے ہندو مشیروں نے بتایا تھا کہ ہندو دورِ حکومت میں "ان کو موٹا اور معمولی کپڑا پہننے کا حکم تھا۔ وہ جوتا پہن کر گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اگر وہ حکم عدولی کرتے تھے تو اُن پر سختی اور جرمانہ کیا جاتا تھا۔ سفر کے وقت جاٹوں کو اپنے ساتھ کتا رکھنا پڑتا تھا تاکہ اُن کی بآسانی شناخت ہو سکے[۱]"

لیکن چچنامہ میں ایسی شہادت بھی موجود ہے کہ کچھ ہندو سردار عربوں کی فتح سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف خود بخود راغب ہوئے۔ غالباً یہ اونچی ذات اور حکمراں طبقے کے لوگ تھے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ لکھا ہے۔ "ناگاہ شخص چند از مشرکان بیامدند و امان خواستند، محمد بن قاسم ایشاں را امان داد، پس گفتند: ای امیر عادل، ما از کیش خود برگشتم و در عز اسلام آمدیم[۲]" جنوبی سندھ میں بدھ مذہب کے پیروؤں نے جن کا برہمن حکمرانوں کے زمانہ میں استحصال کافی بڑھ گیا تھا وہ غالباً بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے تھے[۳]

تیرہویں صدی عیسوی سے پہلے جو صوفیا پنجاب اور سندھ میں آکر سکونت پزیر ہوئے

---

[۱] چچنامہ میں لکھا ہے: جناں لوہانہ یعنی لاکھ و سمہ را فرمان ہنودی کہ جامہ نرم پوشیدندی و مخمل بر سر کردندی، بلکہ گلیم سیاہ بالا وزیر پوشیدندی، و چادر درشت بر کتف انداختندی و سر و پای برہنہ کردندی و ہر کہ جامہ نرم پوشیدی آنرا غرامت کردندی، و چوں از خانہ بیرونی رفتندی، سگی با خود ہمراہ بردندی کہ معرفت ایشاں مبرہن شدی۔
علی بن ابی بکر الکوفی، فتحنامہ سندھ معروف بہ چچنامہ، بتصحیح و تحقیق نبی بخش بلوچ اسلام آباد، ۱۹۸۳ء ص ۱۶۲ تا ۱۶۳

[۲] ایضاً ص۔ ۱۳۴ [۳] ایضاً ص۔ ۱۰۲

تھے اُن کے حالات میں غیر مصدقہ روایات کا استعمال بغیر احتیاط اور تنقید کے کیا ہے۔ اسی طرح سلطان معزالدین بن سام (م ۱۲۰۶ء) سے لے کر سلطان التتمش تک کے عہد کے سیاسی حالات کی تاریخ میں بھی بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ کچھ تاریخی شخصیتوں کی شناخت بھی صحیح نہیں ہے۔ غلام اور آزاد سوار کی حیثیتوں میں جو فرق تھا اس کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً مصنف ترائن کی پہلی جنگ کا (جو کہ ۱۱۹۱ء میں لڑی گئی تھی) ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سلطان کی شکست کے وقت اُس کے ایک باوفا غلام نے اُس کی جان بچائی۔[1] اس جنگ کا سب سے پہلے ذکر منہاج سراج کی طبقات ناصری میں ملتا ہے۔ منہاج کے مطابق جب میدان جنگ میں سلطان شدید زخم کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے گرنے والا تھا تو ایک خلجی سوار نے نہایت پھرتی سے اُس کو اپنے گھوڑے پر سوار کیا اور میدانِ جنگ سے باہر نکال کر لاہور پہنچا دیا۔ خلجی قبیلے کے لوگ غزنویوں کے ابتدائی دور میں مسلمان ہو گئے تھے۔[2] وہ کافی تعداد میں سلطان معزالدین بن سام کی فوج میں سوار اور سردار تھے۔ صدیوں پہلے مسلمان ہونے کی وجہ سے اُن میں سے کسی کے غلام ہونے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ مسلم مملکت میں کسی مسلمان زادہ کو غلام بنانا قانونی طور پر ناجائز تھا۔ سلطان اور اُس کے سرداروں کی فوج میں جو غلام تھے وہ غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے اور اُن کو بچپن میں سوداگروں نے خرید کر اور تھوڑی تربیت دے کر غزنی اور دوسرے شہروں میں فروخت کیا تھا۔[3]

دورِ حاضر کے دوسرے مورخین کی طرح شیخ اکرام نے بھی قطب الدین ایبک کے حالات میں غلطی کی ہے کہ سلطان معزالدین بن سام نے اس کو ترائن کی دوسری جنگ میں فتح کے بعد ۱۱۹۲ء میں ہندوستان میں اپنے نائب کی حیثیت سے تعینات کیا تھا۔

---

[1] آب کوثر۔ دسواں ایڈیشن، ص ۹۱۔

[2] العطبی، تاریخ الیمنی، تیرہویں صدی عیسوی کا فارسی ترجمہ، ابوالشرف الجربازخانی، مخطوطہ، برٹش میوزیم، لندن، Add. 24,950، ورق ۲۰ الف۔ ۲۱ ب۔

[3] منہاج سراج نے قطب الدین ایبک، سلطان التتمش اور اُن کے بڑے امراء کے حالات میں دلچسپ تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ ترک سلاطین اور امراء غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کو بچپن میں غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا تھا۔ التتمش البری خاندان کا فرد تھا جو کہ تیرھویں صدی تک غیر مسلم تھا۔ دیکھئے طبقات ناصری جلد اول صفحہ ۴۴۱۔ ۴۰۳

فخر مدبر، حسن نظامی اور منہاج کے مطابق اس کو شروع میں صرف خطہ کہرام اور سنام کا کاوالی یا مقطع (گورنر) بنایا تھا۔ اس وقت اچہ، ملتان اور لاہور دوسرے امراء کے تحت تھے۔ ہر خطہ کا والی صرف سلطان کے سامنے جواب دہ تھا لیکن جب سلطان کی واپسی کے بعد قطب الدین ایبک نے شمالی ہندوستان میں نمایاں فتوحات حاصل کیں اور اپنے آقا کی قلم رو کو وسعت دی تو اس کی جنگی صلاحیت سے متاثر ہو کر سلطان نے اس کو مشرقی پنجاب سے دہلی، کول اور میرٹھ وغیرہ میں تعینات فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا۔ اس وقت سپہ سالار کی حیثیت وائسرائے جیسی تصور کی جا سکتی ہے۔

لیکن آب کوثر میں ملتان اور سندھ کے سہروردی صوفیاء کے سماجی رول اور دینی خدمات کا تجزیہ بہت دلچسپ پیرایہ میں اور بے تعلقی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوسرے محققین نے اردو اور انگریزی میں شیخ بہاء الدین زکریہ اور اُن کے جانشینوں کا اُن کے معاصر چشتی صوفیاء سے موازنہ کرتے ہوئے معروضیت کو نظر انداز کیا ہے اور چشتی صوفیاء کو ان پر برتری دینے کی کوشش کی ہے۔ شیخ اکرام نے پہلی مرتبہ تاریخی حقائق کی توجیہہ کر کے صحیح طور پر بتایا ہے کہ شیخ بہاء الدین زکریہ کا مطمح نظر اسلام کی اشاعت سے زیادہ حقیقی اسلام کی توسیع تھا۔ وہ ایک بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیتے تھے[1]

چشتی سہروردی صوفیاء سے متعلق آب کوثر کا حصہ کم معیاری ہے۔ مصنف نے اس حصہ کی تیاری میں صباح الدین عبدالرحمٰن کی طرح وضعی ملفوظات کو بغیر پس و پیش کے استعمال کیا ہے۔ دہلی سلطنت کے ابتدائی دور کے چشتی صوفیاء کے متعلق فوائد الفواد، خیر المجالس اور صدر الصدور میں بہت مختصر حوالے ملتے ہیں۔ لیکن یہ حوالے بہت اہم ہیں کیونکہ ان سے صحیح واقعات کا علم ہوتا ہے۔ اس کے بغیر چودھویں صدی میں جو کتابیں کتب فروش کے ایما پر یا پھر سجادہ نشینوں اور مجاوروں نے لکھوائیں اپنے بزرگوں کے مزارات کو پرکشش بنانے کے لیے اُن میں افسانویت کے علاوہ حقائق نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ سب اس وقت ہوا تھا جب شیخ فرید الدین گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیا کی عظمت اور شہرت کی وجہ سے اُن کے پیشروں کی مقبولیت میں بھی نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا وصفی ملفوظات میں شامل افسانوی روایات

---

[1] آب کوثر ص ۱۹۱۔

کو لوگ واقعہ سمجھنے لگے تھے۔ میر خورد نے بھی بعض روایات کو سیر الاولیاء میں شامل کر لیا۔ شیخ اکرام نے بغیر کسی تنقیدی جائزے کے ان روایات کی بنا پر لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر میں مسلمانوں کی فتح سے پہلے سکونت پذیر ہو گئے تھے۔[۱] اس سلسلے میں معتبر ماخذوں کو عمداً نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ ان میں سیر الاولیاء کے برعکس شہادت ملتی ہے کہ وہ دہلی اور اجمیر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد تشریف لائے تھے۔ مثال کے طور پر صدر الصدور میں جو کہ خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ شیخ حمید الدین ناگوری سوالی اور اُن کے پوتے اور خلیفہ شیخ فرید الدین ناگوری کی ملفوظات کا مجموعہ ہے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب چالیس ساتھیوں کے ساتھ سلطان التمش کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ پہلے دہلی میں قیام کیا اور پھر وہاں سے مستقل طور پر اجمیر منتقل ہو گئے۔[۲] صدر الصدور کے بعد بڑی معتبر کتاب تاریخ محمدی مولفہ محمد بہادر خانی ہے۔ یہ تاریخ ۱۴۲۸ء میں شہر کالپی میں لکھی گئی تھی۔ اس میں مولف نے دہلی سلطنت کے حکمراں، شعرا اور صوفیا کی تاریخ بیان کی ہے۔ اگرچہ تفاصیل مختصر ہیں لیکن محمد بہادر خانی نے واقعات کی چھان بین میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے کہیں بھی ایسی روایت درج نہیں کی ہے جس میں افسانویت کی آمیزش ہو۔ خواجہ اجمیری کے متعلق محمد بہادر خانی بھی یہی لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب سلطان التمش کے عہد میں اجمیر میں بسے تھے۔[۳] غالباً مذکورہ بالا کتابوں کو زیادہ قابل اعتبار سمجھتے ہوئے سترھویں صدی کے صوفی عالم اور محقق شیخ شطاری نے میر خورد سے اختلاف کیا ہے۔ اور گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی سلطنت دہلی کے قیام کے بعد ہندوستان آئے تھے۔[۴]

میرے خیال میں مسلم مورخین نے ان صحیح اور تاریخی اہمیت کی روایات کو صرف اس لیے نظر انداز کیا ہے کہ ان کے مقابلہ میں افسانوی روایات پر عوام و خواص کا ایمان ہے اور ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ پرتھوی راج کے زمانہ میں خواجہ صاحب کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن ان کو ہمیشہ اپنی روحانی قوت اور کرامات کے سبب اپنے مخالفین پر

---

[۱] ایضاً ص ۲۰۲

[۲] صدر الصدور، مخطوطہ حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ص ۲۲۷، اوراق کی ترتیب نہیں ہے۔

[۳] تاریخ محمدی، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن۔

[۴] گلزار ابرار، مخطوطہ۔ مانچسٹر لائبریری۔ ورق ۴ اب۔

بالادستی رہی۔ بلاشک وشبہ خواجہ معین الدین چشتی عظیم روحانی پیشوا تھے۔ انھوں نے اسلامی فقر، تقویٰ اور دین داری کی روایات کو قایم کرکے اپنے روحانی جانشینوں کے لیے مثال قائم کی۔ لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ شیخ علی ہجویری کے زمانہ سے صوفیا، میں یہ روایت قایم ہوگئی تھی کہ وہ وہیں جاکر بستے تھے جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو اور اُن کی دینی قیادت کے لیے کسی صوفی کی ضرورت ہو۔ کوئی ایسی معتبر تاریخی شہادت موجود نہیں ہے جس کی بنا پر کہا جاسکے کہ فتح دہلی سے پہلے اجمیر میں مسلمان آباد تھے۔

اسی طرح سے سیر الاولیا، کا یہ بیان بھی کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر سے اپنے بیٹوں کی ضد پر دہلی آئے تاکہ وہ سلطان التتمش سے زمین (ملک) کا فرمان لیں۔ شیخ اکرام نے بلاتامل مان لیا ہے[1] حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ دراصل میر خورد نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عظیم سلاطین بھی چشتی بزرگوں کی عزت اور خدمت کو باعث سعادت سمجھتے تھے واقعہ یہ ہے کہ خواجہ اجمیری سے لے کر شیخ نظام الدین اولیا، اور اُن کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (م۔ ۱۳۵۶ء) تک سلاطین سے تعلق رکھنا یا ان کے دربار میں حاضر ہونا یا آراضی حاصل کرنا دینی اور روحانی نقطہ نظر سے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ معیاری اور معتبر ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتی مشائخ سلاطین وقت کے ذکر تک سے گریز کرتے تھے۔ وہ اپنے خلفار سے بھی یہ امید رکھتے تھے کہ وہ سلطان وقت سے قریبی تعلق نہیں رکھیں گے۔ کوئی خلیفہ شغل یعنی سرکاری ملازمت اختیار نہیں کرسکتا تھا[2] کیونکہ سرکاری ملازمت میں رہ کر ان کے لیے فقر کو اختیار کرنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سلطان التتمش کے عہد میں علمار اور صوفیا کی تو کمی تھی لیکن زمین کی کمی بالکل نہیں تھی۔ منہاج کے مطابق سلطان التتمش اور اس کے امرار علما، اور صلحا، کو فراخدلی سے روپیہ، وظیفے اور املاک دیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ وہ مختلف شہروں اور اقطاعات میں بس کر علم و دین کی ترقی کے لیے کوشش کریں۔ ان کی دریادلی اور سیل تاتار کی وجہ سے وسط ایشیا کی ابتری نے وہاں کے علمار اور صلحار کو ہندوستان منتقل ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ ان میں سے ہر نووارد کو امید سے زیادہ وظیفہ یا زمین (ملک) کی صورت میں مدد ملتی تھی[3] غرضکہ خواجہ کے بیٹوں کو اگر

---

[1] آب کوثر۔ ص ۲۰۵ [2] ملاحظہ کیجئے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۲۳۹ - ۲۴۰
[3] طبقات ناصری۔ جلد اول۔ ص

زمین میں دلچسپی تھی تو وہ اس کو اجمیر میں بآسانی حاصل کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب کو دہلی کا سفر کرنا نہ پڑتا۔
شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حالات زندگی بھی غیر مصدقہ روایات پر مبنی ہیں۔ وضعی ملفوظات اور بعد کے تذکروں کی بناپر مصنف نے سلطان التتمش کی شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے عقیدت اور شیخ کا اُن سے قریبی تعلق دکھایا ہے۔ لکھا ہے کہ اس قریبی تعلق کی وجہ سے التتمش کے عہد میں شہر دہلی میں سماع مقبول عام ہو گیا تھا[۱] فوائد الفواد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں تھی۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری (سہروردی) اور دوسرے صوفیاء بند مکانوں میں خفیہ طور پر محفل سماع منعقد کرتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ علماء کا اس قدر اثر تھا کہ سلطان التتمش نے سماع کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بند مکان میں سماع کی اطلاع پاکر محتسب کے شعبہ سے متعلق لوگ وہاں پہنچ کر مزاحم ہوتے تھے[۲] اردو میں لکھنے والے محققین فوائد الفواد کے ان حوالوں کو نظر انداز کر کے فوائد الفواد میں شیخ نظام الدین اولیاء کے اس بیان پر بڑا زور دیتے ہیں کہ دہلی میں طبقات ناصری کے مولف منہاج اور قاضی حمید الدین ناگوری کے ذریعہ سماع کو قبولیت عام حاصل ہوئی۔ چونکہ منہاج عالم دین ہونے کے علاوہ صدر الصدور اور قاضی القضاۃ کے عہدوں پر فائز تھے لہٰذا محفل سماع پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا[۳] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منہاج اچہ سے ۱۲۲۸ء میں دہلی آئے۔ اور پھر اُن کو سلطان التتمش نے گوالیار کا قاضی بنا کر وہاں بھیج دیا۔ وہ رضیہ کے عہد حکومت میں گوالیار سے مستقل طور پر دہلی منتقل ہو گئے۔ التتمش کے بعد مرکز کمزور ہونے لگا تھا اور ترک امراء دہلی سے باہر اقطاعات اور ولایات میں قریب قریب آزاد ہو گئے تھے۔ لہٰذا دہلی میں سماع پر جو پابندیاں عائد تھیں وہ التتمش اور بختیار کاکیؒ دونوں کے انتقال کے بعد نرم ہوئی ہوں گی۔

آبِ کوثر کے بعد اس سلسلہ کی دوسری جلد رودِ کوثر ہے۔ اس میں سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک کے ہندوستان میں اسلام، مسلم ثقافت اور علوم و دانش کی ترقی کی تاریخ ہے[۴]۔ آبِ کوثر کے مقابلے میں اس کا تحقیقی معیار کافی بلند ہے۔ اس جلد کی تیاری میں مصنف نے فارسی

---

[۱] آبِ کوثر۔ ص ۲۱۴ - ۲۱۵ [۲] فوائد الفواد۔ ص ۲۲۸، ۲۳۹، ۶۰۰

[۳] فوائد الفواد۔ ص ۱۹۲، ۲۳۹ - ۲۴۰۔ [۴] رودِ کوثر۔ نواں ایڈیشن، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

لٹریچر کے علاوہ دورِ حاضرہ میں اردو اور انگلش میں قرونِ وسطیٰ کی تاریخ پر جو علمی کام ہوا ہے اُس سے بھی ناقدانہ طریقہ پر استفادہ کیا ہے۔ مولانا آزاد کے تذکرے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کمال انشاء پردازی نے اُن کے نیم صحیح بیانات کو اردو ادب میں دوامی جگہ دے دی ہے"۔ لیکن شیخ اکرام کے بیانات بھی اکثر تاریخی شخصیات کے بارے میں نیم واقعاتی صورت کے ہیں۔ جن کی آگے نشاندھی کی جائے گی۔

رودِ کوثر میں مغل شہنشاہوں کی حکمت عملی، علم دوستی اور عالم نوازی کے علاوہ مشاہیر اور علماء اسلام کے کارناموں کا تجزیہ اکثر جگہوں پر بہت متوازن ہے خاص طور پر شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری کے علم و فضل اور ان کی ذاتی خامیوں اور خوبیوں کو تاریخی حقائق کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ثابت کرنے کی کوشش میں کہ مغل شہنشاہ اکبر کا اسلام سے گہرا اور نہ ٹوٹنے والا تعلق تھا اکبر کے مخالفین کی تصویر مسخ کر دی گئی ہے خاص طور پر شیخ احمد سرہندی کے (جو کہ مجدد الف ثانی کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں) صحیح خدوخال کا کتاب سے اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ رودِ کوثر کی بنا پر اُن کی اصلاحی تحریک، ان کے دینی فکر اور ان کی شخصیت کا سمجھنا ناممکن ہے دراصل دورِ حاضر کی مصلحتوں کی وجہ سے پاکستان کے کچھ دانشوروں نے تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ ان دانشوروں کی تقلید اشتیاق حسین قریشی اور شیخ اکرام نے کی ہے۔ شروع میں ڈاکٹر قریشی اکبر کے عہد کو اس کی اسلام دشمنی کی بنا پر ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا تاریک ترین دور بتاتے تھے[1] لیکن ۱۹۶۲ء میں ان کی رائے میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ اکبر کو مسلمان اور اس کے دین الٰہی کو ان صوفیاء کے مسلک مطابق سمجھنے لگے جو کہ شریعت اسلامی سے کم فہمی یا لاعلمی کے سبب منحرف ہو گئے[2] لیکن اکبر کی حمایت کے باوجود قریشی شیخ احمد سرہندی کی دینی اور اصلاحی تحریک کی اہمیت کے منکر نہیں ہیں بلکہ انھوں نے تاریخی شواہد کی روشنی میں اُن کی عظمت اور ان کے مذہبی فلسفے کے مسلم معاشرہ پر خوشگوار اثر کا سائنٹفک تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے خلاف رودِ کوثر کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اکبر کی حمایت

---

[1] اشتیاق حسین قریشی، مقالہ، پاکستان فریڈم موومنٹ (انگریزی) جلد اول صـ۳۲

[2] اشتیاق حسین قریشی The Muslim Community of The Indo-Pakistan Sub-Continent, The Haque, 1962 pp. 147-48.

اس لیے کرتے ہیں کہ اکبر مسلم دورِ حکومت کا عظیم فرماں روا اور کئی اعتبار سے منفرد شخصیت کا حامل تھا۔ ان کے نزدیک اگر اکبر کو اسلام سے منحرف بادشاہ سمجھا گیا تو اس کے نتیجہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں ناقابل تلافی کمی واقع ہوگی۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مورخ کو جانب دار نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا کام کسی تاریخی شخصیت کی غلط طریقہ سے حمایت یا مذمت کرنا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ تاریخی شواہد کو دیدہ ریزی سے اکٹھا کرے اور پھر معروضیت کے ساتھ اُس کا بے لاگ تجزیہ پیش کرے۔ ملاّ عبدالقادر بدایونی نے اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں اکبر کے اوپر بہت سے فلسفیانہ نظریات کے اثر کی نشاندہی کی ہے[1] بدایونی کے مطابق اکبر ہندو فلسفہ کے علاوہ محمود پسیخانی کے نقطوی فلسفہ سے بھی کافی متاثر تھا۔ اس کے دربار سے متعلق دانشوروں اور شعراء میں شریف حامل نقوی تھا۔ اس نے اور اس کے دوست ابوالفضل نے اکبر کو اسلام سے منحرف کیا تھا۔ محمود پسیخانی کے مطابق ہر مذہب کی ایک عمر طبعی تھی وہ اسلام کی عمر نو سو سال بتاتا تھا اور کہتا تھا کہ چونکہ نو سو سال پورے ہو گئے تھے لہٰذا نئے مذہب کی ضرورت تھی اور یہ کہ نیا مذہب عرب کے بجائے عجم میں پیدا ہوگا۔ محمود پسیخانی کے مرنے کے کافی بعد سولھویں صدی کے نصف آخر میں ایران میں نقطیوں کا زور بڑھا۔ ان نقطیوں میں سے شریف آملی بلخ اور جنوبی ہندوستان ہوتا ہوا اکبر کے دربار میں پہنچ کر بادشاہ کا درباری بن گیا جلد ہی اُس نے اکبر کے مزاج میں دخل پاکر اس کو دینِ نو قائم کرنے پیغمبرانہ رول ادا کرنے کی ترغیب دی۔ بدایونی رقم طراز ہیں۔ اس سنہ (۹۹۰ھ) میں ذلیل عالم نما جاہلوں نے اس بات پر دلائل پیش کیے کہ وہ صاحب زماں جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہتّر فرقوں کے اختلاف ختم کرے گا وہ صاحب والا کی ذات ہے[2]

اسی زمانہ کے معاصر ایرانی مورخ اسکندر منشی کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کیونکہ اس سے بدایونی کی تائید ہوتی ہے۔ "اس طائفہ کے سرداروں میں میر سید احمد کاشی تھا جس نے بہت سے بدبختوں کو گمراہی کی راہ پر ڈال رکھا تھا۔ پاک اعتقاد بادشاہ نے نصرآباد

---

[1] منتخب التواریخ، جلد دوم ص ص ۲۸۸، ۲۸۹، و جلد سوم ص ۲۰۵، ۲۰۶۔

[2] منتخب التواریخ، جلد دوم ص ۲۸۸ - ۲۸۹۔

کاشان میں اس کو اپنی تلوار سے قتل کر ڈالا۔ اس کی کتابوں میں جو رسالے ملے اُن سے ظاہر ہوا کہ نقطوی حکماء نے اس مذہب کے مطابق عالم کو قدیم مانتے ہیں اور حشر اجساد اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک اعمال کے اچھے یا برے ہونے کے نتیجہ میں جو دنیاوی عافیت یا ذلت ملتی ہے وہی جنت اور دوزخ ہے۔ درویش کمال اصفہانی و درویش ترابی جوان کے مقتدا تھے مع تین چار مریدوں کے خراسان کی راہ میں قتل ہوئے۔ اس طرح جن لوگوں پر ذرا بھی نقطوی ہونے کا شبہ ہوا ان سب کا یہی انجام ہوا۔ درویش خسرو کے بعض ترک مرید اس جرم میں قتل ہوئے۔ اس طرح ظاہر ہوا کہ تمام ممالک محروسہ میں اس جماعت کی ریشہ دوانیاں کی جڑ بہت گہری ہے۔ ہندوستان سے آنے جانے والوں سے معلوم ہوا کہ ابوالفضل پسر شیخ مبارک بھی جو ہندوستان کے فضلا میں ہے اور دربار اکبری میں بہت زیادہ تقرب حاصل کرچکا ہے اسی مذہب کا پیرو ہے۔ اس نے اکبر بادشاہ کو وسیع المشرب بنا کر جادۂ شریعت سے منحرف کر دیا ہے۔ اس کا یہ خط جو میر احمد کاشی کے نام لکھا گیا تھا اور جو میر مذکور کے کاغذات میں دستیاب ہوا ابوالفضل کے نقطوی ہونے پر دلالت کرتا ہے"[1]

بدایونی اور شیخ باقی باللہ کے بڑے فرزند خواجہ کلاں کے مطابق شریف آملی جو جامع فضائل تھا اسی فرقہ کے اکابر سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنے زمانہ کی سخت گیریوں سے تنگ آکر ہندوستان چلا آیا۔ اکبر اس کی تعظیم کرتا تھا اور اس کے ساتھ پیر جیسا سلوک کرتا تھا[2]

خان اعظم عزیز کوکہ، کا مکتوب جو کہ اُس نے اکبر کے مذہبی افکار سے متنفر ہو کر بغیر بادشاہ کی اجازت کے گجرات سے مکہ جاتے ہوئے ۱۵۹۳ء میں لکھا تھا ظاہر کرتا ہے کہ اکبر کے بہت سے درباری بادشاہ کو اپنے عہد کا پیغمبر کہتے تھے۔ اس مکتوب میں مرزا نے شکایت کی ہے کہ ماضی میں عظیم شان و شوکت کے حکمراں ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اور نہ کسی نے نئے مذہب کے قائم کرنے کے لیے جد و جہد کی تھی[3]

لہٰذا شیخ اکرام کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ شیخ احمد سرہندی اکبر کو محض مذہبی تعصب، تنگ نظری

---

[1] عالم آرائے عباسی، جلد ۲، ص ۳۲۶ بمطابق نذیر احمد، تاریخی ادبی مطالع، علی گڑھ، ۱۹۶۱، ص ۱۵-۱۶

[2] خواجہ کلاں، مبلغ رجال۔ مخطوطہ، یونیورسٹی کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، ع ۱۹۱، ورق ۳۱ الف، ۳۲ ب

[3] یہ خط ریلینڈس لائبریری مانچسٹر میں موجود ہے۔ مخطوطہ کا نمبر ۴۲۵ ہے اور ۵ ب سے ۸ ب اوراق پر مشتمل ہے۔

اور اپنی شدت پسند طبیعت کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے اور ان کو اکبر کے سلسلے میں غلط فہمی تھی کہ اکبر اسلام کا دشمن تھا[۱] یہ تجزیہ تاریخ کے ماخذوں سے ناواقفیت یا تاریخی شواہد کی صحیح توجیہہ نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نقطوی فلسفے کے پیرو مذہبی فلسفہ کا اہل صرف خواص کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کا تعلق عوام سے نہ تھا وہ ان کے نزدیک ناقابل اعتنا تھے۔ نئے مذہب کو طاقت یا جبر کے بجائے دلائل سے پھیلانا ضروری تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے نقطویوں میں مذہبی رواداری اور وسیع المشربی پیدا ہوگئی تھی۔ ابن عربی کے تصورِ انسان کامل کی بجائے وہ مرکب مبین کا تصور پیش کرتے تھے۔ وحدت الوجود کے ماننے والوں کا انسان کامل دنیا اور دنیا داری سے ہٹ کر روحانی صلاحیتوں کا حامل تھا جبکہ نقطویوں کا مرکب مبین سیاسی اور روحانی قیادت کا مجاز تھا۔

شیخ اکرام کی اس سلسلہ کی تیسری جلد موج کوثر ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا اور بارہواں ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں آیا۔ اس کا تحقیقی اور علمی معیار پہلی دونوں جلدوں سے بلند ہے۔ چونکہ اس دور کی تاریخ کے ماخذ کافی ہیں لہٰذا انیسویں صدی کے آغاز سے دورِ جدید کے علماء صوفیا اور مسلم دانشوروں کے علمی، ادبی سیاسی اور مذہبی کارناموں کا بڑی حد تک بے تعلقی کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے۔ مصنف نے مولانا شبلی اور ان کے مکتبہ فکر سے متعلق علماء اور دانشوروں پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ لیکن کہیں کہیں لہجہ میں علمی شائستگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یقیناً کوئی جدید تعلیم یافتہ شخص یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ مولانا سلیمان ندوی جدید علوم کے خلاف تھے۔ مولانا ندوی مغربی علوم کے مقابلے میں مشرقی علوم کو فوقیت دیتے تھے لیکن وہ ظلمت پرست نہیں تھے[۲] مولانا آزاد پر شیخ اکرام کا تبصرہ متوازن ہے۔ لکھتے ہیں کہ "علمی معاملات میں یورپ کی سرگرمیوں کے دلی قدردان تھے لیکن معاشرتی معاملات میں آپ قدامت پسند تھے۔ پردہ کے حامی تھے[۳]

---

[۱] رود کوثر ص ص ۱۱۰، ۲۲۲ تا ۳۴۶ [۲] شیخ اکرام قریب قریب تحقیر آمیز الفاظ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے متعلق لکھتے ہیں "جدید علوم کی نسبت معارف کے حقارت آمیز اشارے پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اگر یہ علم کی اشاعت اور معارف نوازی ہے تو پھر بے خبری کس کو کہتے ہیں اور اگر یہی نور اور روشنی ہے تو ظلمت کس کو کہتے ہیں"۔ موج کوثر ص ۲۴۹-۲۵۰۔ [۳] ایضاً ص ۲۵۳

اخیر میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگرچہ اردو میں تاریخ نویسی کی روایت کافی پرانی ہوچکی ہے لیکن تحقیق کا اعلیٰ معیار یورپ کے مقابلے میں بہت نیچے ہے۔ تاریخی شواہد اور مواد کے بے لاگ تجزیہ کی کمی ہے۔ بہت سے اہم موضوعات پر تحقیق شروع ہی نہیں ہوئی۔ مسلم عہدِ حکومت کے نظم ونسق، اور اس کا سماج اور ثقافت پر اثر، سکے جات، اور فنون لطیفہ پر انگریزی کتابوں کا اردو ترقی بورڈ نے ترجمہ کرادیا ہے لیکن از سر نو تحقیق کی ضرورت باقی ہے کیوں کہ حال میں تنقیدی اور تحقیقی اسالیب (METHODOLOGY) میں تبدیلی کے ساتھ بہت سے نئے ماخذ بھی دریافت ہوگئے ہیں۔ علاوہ ازیں قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں فارسی میں تاریخ نویسی کی تاریخ پر تحقیق زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ تاریخی تصورات میں ہندوستان مسلمان اپنے ہم عصر وسط ایشیا اور ایران کے مورخوں سے بہت آگے تھے۔ ہندوستان میں تاریخ پر بعض لکھی ہوئی کتابیں تو دنیا کے قدیم تاریخی لٹریچر میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ہمارے مورخ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں قدیم تاریخ کے تصور کو وسعت بخشی۔ وہ ایک طرح سے فلسفہ تاریخ میں ابن خلدون کا پیشرو ہے۔ اس نے سب سے پہلے اپنے مقدمہ میں فلسفہ تاریخ پر بحث کی اور ثابت کیا کہ تاریخ میں صرف وہ اہم واقعات درج ہونے چاہییں جن کا ملک، معاشرے اور انسانی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ اُن کے یہاں تاریخی اہمیت کے واقعات کا بہترین انتخاب اور واقعات کے اسباب کی بہترین توجیہہ ملتی ہے۔ (ختم شد)

ھماری انگریزی مطبوعات

1. How to Study Islam,
   By Maulana Sadruddin Islahi, Rs. 2-00
2. Muslim & Dawah of Islam,
   By Maulana Sadruddin Islahi, Rs. 2-00
3. Pitfalls on the Path of
   Islamic Movement,
   By Maulana Sadruddin Islahi, Rs. 4-00
4. Islam & the Unity of Mankind.
   By Maulana Jalaluddin Umri. Rs. 3-00
5. Islam the Universal Truth,
   By Maulana Jalaluddin Umri, Rs. 3-00
6. Islam The Religion of Dawah,
   By Maulana Jalaluddin Umri. Rs. 2-50

Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami
Panwali Kothi Dodhpur
A L I G A R H.
202 001